97

ایمان واسلام کی حقیقت

ابتلاء کیا ھے

(فرمودہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

حضور نے تشہد و تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"مَیں اِس جمعہ اُس مضمون کے متعلق ناغہ کرتا ہوں جو مَیں مسلسل بیان کر رہا ہوں۔ کیونکہ اور نہایت ضروری مضمون پیش آگیا ہے جس کی طرف جماعت کی توجہ پھیرتا ہوں۔ یہ مضمون تو اس قابل ہے کہ اس کو وسعت سے بیان کیا جاتے۔ مگر دیر ہو جانے اور حلق میں تکلیف ہونے کے باعث زیادہ نہ بول سکوں گا۔ مگر مَیں اُمید رکھتا ہوں کہ جسقدر بھی اس وقت بیان ہوگا۔ آپ لوگ اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرینگے۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ بالعموم لوگ الفاظ پر کفایت کر لیتے ہیں اور معنے جو لفظوں کے نیچے ہوتے ہیں ان میں جانے کی کم کوشش کرتے ہیں۔ بیسیوں لفظ ہیں جو لوگ سنتے ہیں۔ بولتے ہیں لکھتے ہیں، مگر ان کی حقیقت کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ بلکہ جتنا کسی لفظ کو زیادہ بولتے ہیں۔ اتنا ہی اس کی حقیقت پر کم توجہ کرتے ہیں اور اس سے کم واقف ہوتے ہیں۔

انہی الفاظ میں سے "ایمان" اور "اسلام" کے الفاظ بھی ہیں۔ جن کے معنوں سے کم لوگ واقف ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن سے سنتے سنتے اس قدر یہ الفاظ عام ہو گئے کہ ان کے معنوں کی طرف کبھی توجہ پیدا ہی نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک شخص ایسے جنگل سے آتے۔ جہاں اُس نے کبھی اسلام و ایمان کے الفاظ نہ سُنے ہوں۔ وہ جب سُنے گا۔ تو اس کے لیے یہ لفظ ایسے بے اثر نہ ہونگے جیسے اُس شخص کے لیے ہیں۔ جو بچپن سے ان کو سُنتا رہا ہے۔ جنگل سے آنے والے شخص کی عجیب کیفیت ہوگی اگر ہم اس کو کہیں گے کہ تم ایمان لے آؤ اور مسلمان ہو جاؤ۔ تو وہ ہم سے پُوچھے گا کہ ایمان کیا ہے۔

اسلام سے کیا مطلب ہے ہم کیوں ایمان لائیں۔ اسلام کیوں قبول کریں۔ جب اُس کی حقیقت اس پر کھل جائیگی۔ تب وہ اس کو قبول کرے گا۔ یا رد کر دیگا۔ لیکن جو بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا۔ اور ہمیشہ سنتا رہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کو کبھی ضرورت ہی معلوم نہیں ہوتی کہ مسلمان ہونا ہے کیا چیز۔ لیکن ایمان اپنے اندر ایک بڑی حقیقت رکھتا ہے۔ اور وہ حقیقت نہیں کھل سکتی۔ جب تک ایک شخص اس کے اندر داخل نہ ہو۔ ایمان یہ ہے کہ انسان کے اندر وہ صداقت جو خدا کی طرف سے ہو۔ بیٹھ جائے اور وہ اس کے اندر سے کبھی نکل نہ سکے۔

لیکن ضد سے اور ہٹ سے نہیں، بلکہ یقین کے ساتھ اس میں سے نہ نکل سکے۔ بہت لوگ ہوتے ہیں۔ جو ضد کی وجہ سے کوئی بات مانتے ہیں۔ مثلاً کوئی بچہ چوری کرتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے یا گالی دیتا ہے۔ ماں باپ مارتے ہیں اور کہتے ہیں پھر تو نہیں ایسا کریگا۔ وہ کہتا ہے کروں گا۔ پھر مارتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔ اب تو نہیں گالی دیگا۔ وہ کہتا ہے دوں گا۔ تو یہ ضد ہے۔ جو مار سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کا یہ اصرار یقین کی بناء پر نہیں ہوتا، لیکن ایمان کے معنے یہ ہیں کہ صداقت کو یقین کی بناء پر انسان نہ چھوڑے اور وہ جس بات پر اپنے ایمان کی رُو سے قائم ہے۔ اس کے اپنے پاس دلائل بھی ہوں اور ان دلائل کی وجہ سے ترک نہ کرے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس شخص کے دل میں بشاشت ایمان داخل ہو جائے۔ اس کو اگر آگ میں بھی ڈالدیا جائے تو وہ مرتد نہیں ہو سکتا۔[1] غور کرو کہ جب بشاشت ایمان کا یہ حال ہے تو اعلیٰ ایمان کا کیا حال ہوگا۔ بشاشت ایمان کا یہ مطلب ہے کہ ایمان سے لگاؤ اور مناسبت پیدا ہو جائے۔ جو لوگ ایمان کے اعلیٰ ترین مقام پر ہوتے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ ہم اس لیے آزمائش اور ابتلاء میں ڈالے گئے ہیں۔ تاکہ ہمارے ایمان کا پتہ لگایا جائے۔ وہ تو اس قدر بلند درجہ پر ہوتے ہیں کہ انکی اس طرح آزمائش ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں جو لوگ بشاشت ایمان جو ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے رکھتے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر ان کو زندہ آگ میں ڈالا جائے۔ تو وہ ایمان سے برگشتہ نہیں ہو سکتے۔ جب ادنیٰ ایمان کا تجربہ آگ میں ڈالنے سے ہوگا تو اعلیٰ ایمان کا درجہ تو بہت بلند ہوتا ہے۔ مومن پر جو ابتلاء آتے ہیں ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو پتہ لگے کہ وہ ایمان میں کیسا مضبوط ہے۔

خدا کی طرف سے جو ابتلاء آتے ہیں۔ وہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خود اس شخص کو بتایا

---

[1] بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان

جائے کہ وہ کیسے درجہ ایمانی پر پہنچا ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ دیکھو ہمارا مومن کیسا مضبوط ایمان والا ہے تو چھوٹے درجہ کے ایمان والوں کو جو ابتلاء آتے ہیں۔ وہ آگ میں ڈالنا تک ہوتے ہیں اور اس وقت بھی وہ حقیقت سے منہ پھیر نہیں سکتے۔ اور دوسرے درجہ میں خود اس شخص کو یقین ہوتا ہے اور اسکے ایمان کا ذرہ خطرہ نہیں ہوتا، لیکن دوسروں کو یقین دلانا ہوتا ہے کہ یہ شخص ایمان کے اس درجہ میں ہے کہ تمہارا تکلیفیں دینا اس شخص کو ڈگمگا نہیں سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر اور اُحد وغیرہ مقامات پر جو تکالیف پہنچی تھیں۔ وہ اس لیے نہ تھیں کہ منافقین اور کفار پر آنحضرت کے ایمان کی پختگی ظاہر کی جاتی یا خود آنحضرتؐ کو آپ کے ایمان کا پتہ بتایا جاتا۔ کیونکہ آپ کے ایمان کا پتہ تو غارِ حرا میں ہی لگ گیا تھا، بلکہ ان کی غرض یہ تھی کہ دشمنوں کو آگاہ کر دیا جاتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا ایسا مقبول اور پیارا بندہ ہے کہ تمہارا اس کو تکالیف دینا اور تمہارا اس کو مٹانا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تمہاری ہر قسم کی شرارتوں اور مظالم کے مقابلہ میں یہ بڑھے گا۔ اور تم اس کے مقابلہ میں ناکام رہو گے۔ گویا اس طرح تین طرح کے ابتلاء ہوتے ہیں (۱) کسی شخص کو خود اس کی ایمانی حالت سے آگاہ کرنے کے لیے (۲) دوسروں کو کسی کی ایمانی حالت کی عمدگی بتانے کے لیے (۳) تیسری قسم کے ابتلاء جو انبیاء اور ماموروں اور ان کے نائبوں کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تا لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ وہ خدا کے مقبولوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ خدا کے پیارے ہر میدان میں بڑھیں گے۔ اور تمام مخالفتوں کے باوجود کامیاب ہونگے۔

پس یہ تین قسم کے ابتلاء ہوتے ہیں اور چھوٹا اور بہت ہی کم درجہ ایمان کا جو بشاشت ایمان کہلاتا ہے اس کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ آگ میں پڑ کر بھی ایمان سے علیحدگی نہ کی جائے، لیکن اب یہ حالت ہے کہ بعض لوگوں کو اگر محلہ والے ذرا ستائیں۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ابتلاء میں پڑ گئے۔ حالانکہ اس کو ابتلاء قرار دینا درست ہی نہیں۔ لوگوں کو یہ غلطی لگی ہوئی ہے کہ مثلاً قرآن میں آتا ہے کہ ہم نے مومنوں کو آزمایا۔ وہ کہتے ہیں جب خدا اس قسم کی تکالیف کو ابتلاء قرار دیتا ہے۔ تو ہم کیوں نہ کہیں لیکن یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص کا مجھ پر احسان ہے اور جس شخص کے متعلق کہا گیا ہے وہ بھی کہے کہ میرا فلاں پر احسان ہے تو یہ اس کی بے شرمی ہوگی۔ پس خدا تو کہہ سکتا ہے کہ ہم نے ابتلاء میں ڈالا۔ مگر بندہ کا یہ حق نہیں کہ ان تکالیف کو ابتلاء کے نام سے موسوم کرے۔ دوسرا تعریف کر سکتا ہے۔ اپنی تعریف آپ کرنا کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔ یا اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص کسی کے متعلق کہے کہ زید صاحب تشریف لائے ہیں اور زید بھی کہے کہ میں تشریف لایا ہوں۔ تو یہ درست نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ ایسا کہتے ہیں۔ وہ شاہی کلام کے آداب کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہہ سکتا ہے۔ مگر ہم نہیں کہہ سکتے۔ تم کبھی نبیوں کی زبان سے نہیں سنو گے کہ وہ کہیں گے کہ ہمارا امتحان لیا گیا۔ عربی زبان میں ابتلاء کے دو معنی ہوتے ہیں۔ پہنچنا یا ہو جانا۔ مثلاً ایک عرب کو اگر بخار ہو جاتے تو وہ بخار کے لفظ کے ساتھ ابتلاء کا لفظ استعمال کرے گا۔ یعنی اس کو بخار ہو گیا۔ وہاں ابتلاء کے معنے آزمائش کے نہیں ہونگے۔

(۲) فضل اور انعام اور امتحان کے معنے ہوتے ہیں۔ یہ تعریف کا کلمہ ہوگا۔ جو انسان اپنے لیے خود استعمال نہیں کر سکتا۔ دوسروں کی طرف سے ہو سکتا ہے۔

تو بہت لوگ ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو ابتلاء کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہیں ملازم ہو۔ اس کے افسر ناراض ہو جائیں۔ یا کوئی احمدی ہو اور اس کا بیٹا بیمار ہو جاتے تو وہ کہہ دیگا کہ بڑا ابتلاء آیا تھا مگر میں قائم رہا۔ یا محلہ والے مخالفت پر آمادہ ہیں اور نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ جائیداد خطرے میں ہے۔ یہ ابتلاء ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے ادنیٰ درجہ کے مقابلہ میں بھی ان تکالیف کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسا کہ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ نے ایک مولوی کا قصہ سنایا کہ اس نے ایک عورت کا نکاح پر نکاح پڑھا دیا تھا۔ جب اس کو حضرت مولوی صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب آپ نے یہ کیا کیا۔ تو اس نے جواب دیا کہ مولوی صاحب مجھ پر بہت ظلم ہوا ہے۔ اگر مَیں نکاح نہ پڑھاتا تو کیا کرتا۔ مولوی صاحب کو خیال آیا کہ واقعی زمیندار لوگوں نے سختی کی ہوگی۔ مجبوراً نکاح پڑھانا پڑا ہوگا۔ آپ نے پوچھا، ہاں مولوی صاحب بتاؤ تو سہی ہوا کیا۔ اس نے کہا کہ "چرٹے جڈا روپیہ میرے ہتھ تے رکھ دِتا۔ نہ نکاح پڑھدا تاں کی کردا" یعنی چرٹے کے برابر روپیہ میرے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ اگر نکاح نہ پڑھتا تو کیا کرتا۔

تم میں سے بہت سے اس مولوی پر ہنستے ہیں، لیکن تم میں بھی ہیں جو ایسی باتوں پر ابتلاء پکار اُٹھتے ہیں اور لیسے خدا کے بندے ہیں۔ جو تمہاری ان باتوں پر ہنستے ہیں۔

بعض لوگ ہیں جو ذرا محکمہ والے جن کے ہاں ملازم ہوں، ناراض ہوں۔ تو کہتے ہیں۔ ہم ابتلاء میں پڑ گئے۔ محلہ داروں نے ذرا تکلیف دی تو ابتلاء ابتلاء پکار اُٹھتے ہیں۔ شہر والوں نے سختی کی۔ تو ابتلاء پکارتے ہیں۔ بیٹا یا کوئی اور بیمار ہوا۔ تو ابتلاء کا نام لیتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے فضل کے مقابلہ میں جو وہ دمبدم تم پر کر رہا ہے یہ معمولی تکالیف کہاں ابتلاء ہو سکتی ہیں۔

اور مومن کب ان کو خاطر میں لا سکتا ہے۔ جب کہ آگ میں پڑنا بھی اس کو اس کی جگہ سے حرکت

نہیں دے سکتا۔کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ لوگوں کا مومن کو تکلیف دینا تو ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ کوئی پیٹھ کے پیچھے کسی کے مُکّہ مارے، لوگوں کا شور مچاتے اس کی حالت کو قابلِ رحم بنانے کے خود شور کرنے والوں کی حالت کو قابلِ رحم بناتا ہے۔کیونکہ جو شخص قطب صاحب کی لاٹھ پر بیٹھا ہے یا قلعہ میں بیٹھا ہے۔ اس پر کسی کا تھوک پھینکنا یا کنکر مارنا کچھ بھی مؤثر نہیں ہو سکتا۔ ہاں تھوک پھینکنے اور کنکر مارنے والے کی حالت البتہ قابلِ رحم ہے۔ پس جو شخص خدا کی گود میں ہو۔ جیسا کہ مومن ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ معمولی تکالیف کہاں ابتلاء ہو سکتی ہیں۔ تم دیکھو کہ کبھی قطب صاحب کی لاٹھ پر بیٹھنے والا اور قلعہ نشین کسی کے تھوک پھینکنے یا گردِ ڈالنے کو اپنے لیے ابتلاء نہیں کہے گا۔ تو جو شخص خدا کی گود میں ہو وہ کب کہہ سکتا ہے کہ میں ابتلاء میں ہوں یا تو اس کو اقرار کرنا چاہیئے کہ وہ خدا سے بے تعلق ہے اور اس کی گود میں نہیں۔ یا اس قسم کی باتوں کو ابتلاء نہیں کہنا چاہیئے۔

پس جو شخص خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور کسی بڑے سے بڑے حادثہ پر بھی کہتا ہے کہ میں ابتلاء میں ہوں۔ تو اس نے دراصل خدا کو نہیں مانا۔ اس نے اسلام اور احمدیت کو نہیں سمجھا اُس کا دعویٰ درست نہیں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مرزا صاحب کو سچا مانتا ہے معمولی معمولی تکلیفوں اور دشمنوں کی شرارتوں کی فکر اس کو تب ہو سکتی ہے۔ جبکہ اس میں ایمان کی کمی ہو۔ یا خدا کو مانتا تو ہو۔ مگر یہ خیال ہو کہ وہ بیمار اور کمزور ہے۔ میری مدد نہیں کر سکتا۔ ورنہ جو خدا پر پُورا پُورا یقین رکھتا ہے۔ اس کی قدرت اور طاقت کا قائل ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پس یقین کامل ہونا چاہیئے کہ ایمان کیا ہے اور ایسا ایمان ہونا چاہیئے کہ کوئی بڑی سے بڑی مصیبت ابتلاء نہ کہلائے۔ کیونکہ اگر کوئی کسی تکلیف کو ابتلاء سمجھتا ہے تو وہ ایمان کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچا۔ پہلی منازل ہی طے کر رہا ہے۔

ہاں خدا سے دُعا ہونی چاہیئے کہ وہ ہمیں ڈگمگانے سے بچائے۔ بندے سے سوال نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ بچائے۔ انسان یہ کہے خدا یا تیری مدد کا محتاج ہوں۔ تیرے استغناء سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے تجھی سے کہتا ہوں کہ میری مدد کر۔

یہی نکتہ ہے جو سورۃ فاتحہ میں بیان کیا گیا ہے وہاں مومن دُعا کرتا ہے۔ ایاك نعبد۔ خدایا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ایاك نستعین تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی عبادت کرنے والے کو اپنی طرح کے عابد تو نظر آتے ہیں۔ مگر وہ جن سے خدا کے سوا مدد مانگے۔ کوئی نہیں نظر آتا۔ اس لیے مدد کے لیے مومن کی نظر میں خدا کے غیر کچھ ہے ہی نہیں۔ صرف خدا ہی خُدا ہے جس سے مانگتا ہے پھر اھدنا الصراط میں کہتا ہے کہ میں جس رستہ پر ہوں اس پر سب چلنے والے ہی نظر

آتے ہیں۔کوئی مدد دینے والا نہیں۔آپ ہی اس رستہ میں مدد فرماتے۔چلنے والے سب بندے ہیں۔ اور جو غیر ہیں وہ مغضوب اور ضالین ہیں۔گویا مُردے ہیں۔ان پر کیسے نظر پڑ سکتی ہے یا ان سے کوئی کیا ڈر سکتا ہے۔پس دُنیا تمام رُعبوں اور قوتوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ مومن سے دُور ہو جاتی ہے خُدا ہی خُدا اس کے سامنے ہوتا ہے اس لیے وہ کبھی ڈرپوک اور بُزدل نہیں ہوتا۔کوئی بڑی سے بڑی تکلیف اس کو خُدا کے فضل سے متزلزل نہیں کر سکتی۔مومن اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ میں دیدیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے کرے۔

اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ آپ لوگ سمجھیں اور مصائب و تکالیف و آلام آپ کے لیے تزلزل کا باعث نہ ہوں بلکہ آپ کا ایمان اسقدر بلند درجہ پر ہو کہ دُنیا کے تمام کافر آپ کے سامنے مُردہ ہوں۔ان کی پہنچائی ہوئی تکالیف کچھ نہ کر سکیں۔تمہاری نظر خدا پر ہو۔اور اس کے غیر تمہاری نظر میں ایک پشہ کے برابر حقیر بلکہ اس سے بھی زیادہ حقیر ہوں۔

(الفضل ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ئہ)